سہ ماہی

# جی

لاہور، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱ء

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سُخن تا بہ لَب نہیں آتا

- اعجاز القرآن پر علامہ خطابیؒ کی اہم تحریر
- نسخ کے مسئلے پر امام غزالیؒ کا موقف
- انکار حدیث پر مولانا ایوبؒ کا تفصیلی کلام

مدیر: محمد دین جوہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سہ ماہی

# جی

لاہور، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱ء

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

## مشمولات





برائے رابطہ، استفسار اور اظہار آرا: shahidmahmood@baatdiscourse.com قیمت: ۱۲۰ روپے

محمددین جوہر، مدیر ”جی“ نے تایا سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور سے چھپوا کر حسن منزل، اردو بازار، لاہور سے شائع کیا۔

اہم نوٹ:

اس شمارے میں قرآن مجید کی آیات بھی شامل ہیں۔ ان کی درستی پر بساط بھر توجہ دی گئی ہے لیکن اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ادارے کو مطلع فرمائیں۔

قانونی مشیر:
کامنز لا کمپنی، نوائے وقت بلڈنگ، ۴۔ شارع فاطمہ جناح روڈ، لاہور

# فلسطین کا یک ریاستی حل

ساری مقدسی

ترجمہ: نادر عقیل انصاری

اسرائیل اور فلسطین کے تنازعہ کا دو ریاستی حل اب ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا یہ بحث اب بیکار ہے کہ ماضی میں کس نے کیا پیشکش کی اور کس نے کون سی تجویز مسترد کی۔ اوسلو امن مذاکرات نے اس وقت دم توڑا جب یاسر عرفات مذاکرات کی میز سے اٹھ کر چلے گئے یا وہ اس وقت ایک قصہ پارینہ بنا جب ایریل شیرون نے مسجد اقصیٰ کا دورہ کیا۔ اب فقط زمینی حقائق اہمیت کے حامل رہ گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسرائیل نے سنہ ۱۹۶۷ء سے اب تک، چالیس برس کے دوران، مقبوضہ فلسطینی سرزمین پر بھرپور آبادکاری کے نتیجے میں اس رقبے پر مستقل قبضہ کر لیا ہے جس پر فلسطین کی ریاست قائم کرنے کی امید تھی۔ اسرائیل کے قیام اور فلسطین کی بربادی کے ساٹھ برس بعد آج ہم وہیں ہیں جہاں سے ابتدا کی تھی: دو اقوام ایک ہی خطۂ زمین پر ایک دوسرے کے برابر آباد ہیں۔ اب اگر یہ خطہ تقسیم نہیں ہو سکتا تو برابری کی بنیاد پر دونوں کی مشترکہ ملکیت قرار پانا چاہیے۔

یہ صورتحال شاید بہت سے امریکیوں کو چونکانے کا سبب بنے۔ کیونکہ مدتوں دو ریاستی حل کے لیے تگ و دو کے بعد جب لگتا تھا کہ شاید اب مسئلہ حل ہونے کو ہے، اس مرحلے پر اس منصوبے کو ناقابل عمل جان کر ترک کر دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ منصوبہ واقعی ناقابل عمل ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق مغربی کنارے کے چالیس فیصد رقبے پر اب اسرائیلی انفراسٹرکچر قائم ہے - سڑکیں، آبادیاں، فوجی اڈے - جو بڑی حد تک فلسطینی آبادی کے لیے ممنوع ہیں۔ اسرائیل نے نہایت گہری منصوبہ بندی کے ساتھ باقی ماندہ علاقے کو درجنوں قطعات میں تقسیم کر دیا ہے جو ایک دوسرے سے منفصل ہیں اور بیرونی دنیا سے منقطع، اور ان کا مکمل کنٹرول اسرائیلی حکومت کے ہاتھوں میں ہے جسے وہ، آخری اطلاع آنے تک، ۶۱۲ فوجی چوکیوں کی مدد سے نافذ کرتی ہے۔

مزید برآں، ایک رپورٹ کے مطابق، مقبوضہ علاقوں میں لا کر بسائی گئی یہودی آبادی، جو اب پانچ لاکھ کے قریب ہے، نہ صرف مسلسل بڑھ رہی ہے بلکہ اس میں اضافے کی رفتار اسرائیل کی آبادی میں اضافے سے تین گنا زیادہ ہے۔ اگر آبادی میں اضافے کی رفتار یہی رہتی ہے تو بارہ برس کے

اندر یہ آبادی دگنی ہو کر دس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ بہت سے اسرائیلی آبادکار مسلح ہیں اور ان کا محرک نظریاتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا امکان بہت کم ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر اس سرزمین کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوں گے جو ان کے عقیدے کے مطابق انہیں اللہ نے عطا کی ہے۔ یہ حقائق اس امر کے ادراک کے لیے کافی ہیں کہ موجودہ امن مذاکرات ایک علمی کاوش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

۱۹۹۰ء سے اب تک کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جب اسرائیل نے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں آبادکاری کو کسی خاطرخواہ حد تک معطل یا منقطع کیا ہو۔ اور مقبوضہ علاقوں میں آبادکاری بین الاقوامی قانون کی بین خلاف ورزی ہے۔ گزشتہ نومبر میں اناپولس سربراہ کانفرنس سے معاً پہلے اسرائیل نے مغربی کنارے میں مزید فلسطینی سرزمین پر قبضہ کرنے کا اعلان کیا، اور سربراہ کانفرنس کے معاً بعد ۳۰۷ گھروں کی تعمیر کے ذریعے ہارہوما کی آبادی میں توسیع کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد اب تک اسرائیلی حکومت مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں سینکڑوں مزید گھر تعمیر کرنے کے منصوبوں کا اعلان کر چکی ہے۔

مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں اسرائیلی آبادکاری کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسرائیل میں جگہ کی قلت ہے۔ وہ اس سرزمین میں اس لیے آباد ہو رہے ہیں کیونکہ ان کا قدیم مذہبی عقیدہ ہے کہ فقط یہودی ہونے کی وجہ سے ان کا اس سرزمین پر حقِ ملکیت بنتا ہے۔ نیشنل یونین بلاک کی ایک سیاسی جماعت مولیدیت کا، جس کی اسرائیلی پارلیمان میں خاطر خواہ نمائندگی ہے، یہ موقف ہے کہ "اسرائیل کی سرزمین یہودی قوم، اور صرف یہودی قوم، کی ملکیت ہے"۔

مولیدیت کا موقف وزیر اعظم احود اولمرٹ کے موقف سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے، جیسا کہ بعض اسرائیلیوں کا دعویٰ ہے۔ گو کہ وزیر اعظم اولمرٹ کہتے رہے ہیں کہ ان کے خیال میں اصولی اعتبار سے اسرائیل کو غزہ اور مغربی کنارے کے وہ تمام علاقے خالی کر دینے چاہئیں جہاں فلسطینیوں کی آبادی زیادہ ہے، لیکن ۲۰۰۶ء میں انہوں نے حتمی دعویٰ کیا کہ، "سماریہ کی ہر ہر پہاڑی اور یہودیہ کی ایک ایک وادی ہمارے تاریخی وطن کا حصہ ہے" اور یہ کہ، "ہم اسرائیل کی تمام سرزمین پر اسرائیلی قوم کے تاریخی حق ملکیت پر سختی سے قائم ہیں"۔

یہاں یہ مفید ہو گا کہ ہم اسرائیلی اصطلاحات "یہودیہ" اور "سماریہ" کی کچھ وضاحت کر دیں۔ اسرائیلی اہلکار بائبل کی ان دونوں قدیم اصطلاحات سے مغربی کنارہ مراد لیتے ہیں۔ اوسلو مذاکرات کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ دو ریاستی حل کی طرف پیش قدمی کی جائے جن کی ابتدا کو آج دس برس ہونے کو ہیں۔ مگر آج تک اسرائیلی حکومت اسرائیلی نصابی کتب میں مغربی کنارے کو "یہودیہ" اور "سماریہ" کا نام دیا جاتا ہے اور انہیں مقبوضہ علاقے نہیں بلکہ اسرائیل کا حصہ دکھایا جاتا ہے۔

فلسطینی علاقوں پر اسرائیلی استحقاق کے اس تصور کے بعد فلسطینیوں کے لیے کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ آبادی میں عرب تناسب کا ایک "مسئلہ" بن کر رہ جاتے ہیں۔

فلسطینیوں کو ایک مسئلہ قرار دینا کوئی نئی حکمت عملی نہیں ہے۔ اسرائیل کا قیام ۱۹۴۸ء میں ایک یہودی ریاست کے طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ اور اس کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فلسطینیوں کی زیادہ سے زیادہ آبادی کا فوجی قوت کے ذریعے انخلا عمل میں لایا گیا۔ یہ وہ المناک تاریخی سانحہ ہے جسے فلسطینی "نکبہ" کہتے ہیں، جسے ہر سال وہ اس ہفتے یاد کرتے ہیں۔

اسرائیلی مؤرخ بینی مورس لکھتا ہے کہ، "اسرائیل کی شکل میں ایک یہودی ریاست وجود میں نہیں آسکتی تھی جب تک ساٹھ لاکھ فلسطینیوں کو بے گھر نہ کیا جاتا۔۔۔ اس آبادی کو جلاوطن کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا"۔ مورس کے خیال میں، یہ "وہ صورت حال تھی جو تاریخ میں نسلی تطہیر کے لیے جواز فراہم کرتی رہی ہے"۔

فلسطینیوں کو ایک ایسا مسئلہ قرار دینا جسے جلاوطنی کے ذریعے ہی حل کیا جا سکتا ہے، ۱۹۴۸ء سے قدیم تر ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت سے موجود ہے جب صیہونی تحریک نے اس سرزمین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کے لیے منصوبہ بندی کی ابتدا کی۔ ۱۹۱۷ء میں، جب برطانوی حکومت نے سرکاری سطح پر صیہونیت کو قبول کیا، اس علاقے میں آبادی کی اکثریت غیر یہودی تھی۔ برطانوی پارلیمان کے واحد یہودی رکن ایڈون مونٹاگو نے اسرائیل کے قیام کے منصوبے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس کی شدید مخالفت کی۔ امریکی صدر ولسن نے ۱۹۱۹ء میں حقائق جاننے کے لیے ہنری کنگ اور چارلس کرین پر مشتمل ایک مشن فلسطین روانہ کیا جس نے ایڈون مونٹاگو سے اتفاق کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ "اس منصوبے کے لیے بڑے پیمانے پر قوت کا استعمال کرنا ہو گا۔ مانا کہ بعض اوقات ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن کے نفاذ کے لیے فوجی قوت درکار ہوتی ہے، لیکن اس میں کیا شک ہے کہ ایسے فیصلے کسی معقول سبب کے بغیر محض کسی کھلے ظلم وجور کی خاطر نہیں کیے جاتے"۔

لیکن ایسے فیصلے روا رکھے گئے۔ یہ وہ تنازعہ ہے جس کا سبب پہلے دن سے یہ رہا ہے کہ صیہونی تحریک فلسطین کی سرزمین پر بلاشرکت غیرے استحقاق کا دعویٰ رکھتی ہے۔ کیا فلسطینیوں کی جانب سے بھی تشدد کیا گیا ہے؟ بالکل۔ کیا فلسطینیوں کے پاس ہمیشہ اس تشدد کا جواز بھی رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن یہ سوال ضرور رہا ہے کہ کہ اگر آپ کو کہا جائے کہ آپ کے اپنے وطن میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اور یہ کہ آپ کا وجود ہی ایک مسئلہ بن گیا ہے، تو آپ کیا کریں گے؟ تاریخ میں کسی قوم نے محض کسی دوسری قوم کی خواہش کی بنا پر اپنا گھر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ فلسطینی قوم کے ہاں آج بھی وہ جذبات زندہ ہیں جو کبھی امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل میں پروان چڑھے تھے، جب امریکی سفید فام فوجوں نے ان مقامی آبادیوں کو منظم فوجی یلغار سے یکسر فنا کرنے کے لیے حملے کیے تھے، اور ریڈ انڈین آبادی نے مسلح مزاحمت کی تھی۔

یہ تشدد ختم ہو سکتا ہے، اور ایک پر امن حل کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، لیکن صرف اس وقت جب ہر فریق یہ تسلیم کر لے کہ دوسرا فریق بھی یہاں آباد رہے گا۔ بہت سے فلسطینیوں نے اس مقدمے کو مان لیا ہے، اور ایک بڑھتی ہوئی تعداد ایک آزاد فلسطینی ریاست کے مطالبے سے دستبردار ہوتی جا رہی ہے، اور اس کی بجائے صرف ایک جمہوری، سیکولر، اور کثیرالثقافتی ریاست کے امکان کو قبول کر رہی ہے، ایک ایسی ریاست جس میں وہ اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ برابر کے حصے دار ہوں۔

اکثر اسرائیلی ابھی اس موقف کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ بے شک، کچھ اسرائیلی اس لیے تذبذب کا شکار ہیں کہ اس کے نتیجے میں انہیں ایک ”یہودی ریاست“ کو خیر باد کہنا پڑے گا، اور اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسرائیل کبھی بھی خالصتاً یہودی ریاست نہیں تھا، اور یہ کہ ابتدا سے ہی ایک ملک میں ایک قوم کو دوسرے شہریوں کے مقابل خصوصی مراعات دینے کا تصور بنیادی طور پر غیر جمہوری اور غیر منصفانہ تھا۔

لیکن اسرائیل بعینہٖ اس پر عمل کرتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے شہریوں کے مابین اسرائیلی قانون یہودیوں کو وہ حقوق دیتا ہے جو غیر یہودی شہریوں کو حاصل نہیں۔ کسی بھی اعتبار سے اسرائیل ایک حقیقی جمہوریت نہیں ہے: وہ خالصتاً ایک نسلی اور مذہبی ریاست ہے، جو اس خطہ زمین کی، جس پر وہ قائم ہے، کثیر الثقافتی تاریخ کا یکسر انکار کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

فلسطینیوں کے ساتھ اس تنازعے کے حل کے لیے اسرائیلی یہودیوں کو اپنی خصوصی مراعات چھوڑنی ہوں گی اور ان فلسطینیوں کے 'حق مراجعت' کو تسلیم کرنا ہو گا جنہیں ان کے گھروں سے بے دخل کیا گیا تھا۔ اس کے بدلے میں ان کے لیے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ مسلسل حالت جنگ میں رہنے کی بجائے، امن ، سلامتی اور خوشحالی کے ساتھ فلسطینیوں کے زندگی گزار سکیں۔

لگتا ہے کہ ان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ اولمرٹ نے حال ہی میں خبردار کیا ہے، ہر روز مزید فلسطینی اپنی مساعی کا رخ ایک آزاد فلسطینی ریاست کی بجائے، جنوبی افریقہ جیسی تحریک کی طرف مبذول کر رہے ہیں، جس کا مطالبہ ایک ہی ریاست کے اندر، تمام شہریوں کے لیے، مذہب کی تفریق کے بغیر، مساوی حقوق کا حصول ہے۔بے شک، اولمرٹ نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ ”ظاہر ہے کہ یہ ایک زیادہ صاف ستھری، اور کہیں زیادہ مقبول جدوجہد ہے، اور بالآخر کہیں زیادہ طاقتور بھی“۔ مجھے اس سے مکمل اتفاق ہے۔

لاس اینجلس ٹائمز، ۱۱/ مئی سنہ ۲۰۰۸ء

[ ساری مقدسی یونیورسٹی آف کیلے فورنیا میں انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر ہیں۔ ]